جموں و کشمیر کا پہلا افسانہ نگار : محمد الدین فوقؔ

پروفیسر قدوس جاوید
سابق صدر شعبہ اردو، کشمیر یونیورسٹی
رابطہ: 9419010472999

[پروفیسر قدوس جاوید اگرچہ ریاست جموں وکشمیر کے نامور علمی ادارے کشمیر یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو سے متعلق رہے ہیں لیکن جدید اردو ادبی منظر نامے اور ادبی تحاریک و رجحانات پر مکمل اتھارٹی کے ساتھ موقف رکھنے والے ذیرک ناقد اور محقق کے طور اردو کے عالمی حلقے میں اپنی انتہائی معتبر شناخت رکھتے ہیں۔ انہوں نے ریاست کے ادب اور ادیب کو موضوع بنا کر بے شمار تحریریں قلم بند کی ہیں۔ جموں وکشمیر کے اوّلین افسانہ نگار اور تاریخ دان محمد الدین فوقؔ کے بارے میں ان کا لکھا یہ مضمون انتہائی دستاویزی نوعیت کا ہے اور اپنی طرح کی پہلی کوشش۔]

محمد الدین فوقؔ (۱۸۷۷ء۔ ۱۹۴۵ء) ریاست جموں وکشمیر کے پہلے افسانہ نگار ہیں۔ لیکن اس دعوے کو ثابت کرنے اور اس پر یقین کرنے کے لئے دلائل وشواہد کی ضرورت پیش آئے گی۔

کیوں؟ اس لئے کہ ریاست جموں وکشمیر میں اردو افسانہ نگاری کا آغاز کب اور کس کے ہاتھوں ہوا؟ اس کے بارے میں ابھی تک کسی بھی ادبی محقق یا مورخ نے کچھ نہیں لکھا ہے۔ عبدالقادر سروری اور حبیب کیفوی سے لے کر محمد یوسف ٹینگ، حامدی کاشمیری اور غلام نبی خیال جیسے مستند دانشوروں کا قلم بھی اس مسئلے پر خاموش ہی نظر آتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ مرزا حامد بیگ ''اردو افسانے کی روایت'' کی تلاش میں، درد مند اکبر آبادی، سید رفیق حسین، ابوالفضل صدیقی، محمد علی ردولوی اور مسز عبدالقادر کے افسانوں تک تو پہنچ جاتے ہیں لیکن نہ جانے کیوں محمد الدین فوقؔ کے افسانوں تک ان کی رسائی نہیں ہوسکی۔

لیکن مطالعے کی آسانی کے لئے یہ طے کرنا ضروری بھی ہے کہ ریاست جموں وکشمیر میں اردو افسانے کا نقطۂ آغاز کہاں اور کیسا ہے؟ تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں، کشمیر کے مشہور مورخ، محقق، صحافی، شاعر اور فکشن نگار محمد دین فوقؔ نے اہل کشمیر میں، حب الوطنی، انسان دوستی، اعلیٰ اخلاقیات اور سیاسی بیداری کے جذبات پیدا کرنے کے لئے، ''حکایت'' (افسانچہ یا منی افسانہ) کی ہیئت میں جو افسانے لکھے، انھیں ریاست جموں وکشمیر کے ابتدائی افسانے کہہ سکتے ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ فوقؔ کے یہ افسانے اردو کے اوّلین افسانوں ''نصیر اور خدیجہ'' (راشد الخیری، مطبوعہ مخزن۔ لاہور دسمبر ۱۹۰۳ء)، ''تصویرِ غم'' (درد مند اکبر آبادی۔ مخزن، لاہور، فروری ۱۹۰۴ء)، ''ایک پرانی دیوار'' (علی محمود۔ مخزن، لاہور، اپریل ۱۹۰۴ء)، ''بدنصیب کا لال'' (راشد الخیری۔ مخزن لاہور، اگست ۱۹۰۵ء)، ''غربت و وطن'' (سجاد حیدر یلدرم۔ اردوئے معلیٰ، علی گڑھ، اکتوبر ۱۹۰۶ء)،

’’دوست کا خط‘‘ (سجاد حیدر یلدرم مطبوعہ مخزن لاہور اکتوبر ۱۹۰۵ء)، ’’نابینا بیوی‘‘ (سلطان حیدر جوشؔ مطبوعہ مخزن لاہور دسمبر ۱۹۰۷ء)، ’’عشق دنیا اور حب وطن‘‘ (پریم چند۔ مطبوعہ، زمانہ، کانپور اپریل ۱۹۰۸ء)، ’’دنیا کا سب سے انمول رتن‘‘ (مشمولہ؛ سوز وطن۔ جون ۱۹۰۸ء)، ’’گناہ کا خوف‘‘ (محمد علی ردولوی، لگ بھگ ۱۹۰۹ء)، ’’نینی تال‘‘ (علی محمود۔ ادیب، الٰہ آباد، جولائی ۱۹۱۰ء)، ’’بہرا شہزادہ‘‘ (خواجہ حسن نظامیؔ۔ ہمایوں، لاہور، جنوری ۱۹۱۳)، ’’ایک پارسی دوشیزہ کو دیکھ کر‘‘ (نیاز فتحپوری۔ تمدن، دہلی ،جنوری ۱۹۱۳ء)، ’’پھول‘‘ (پنڈت سدرشن۔ مخزن لاہور، جنوری ۱۹۱۴ء) وغیرہ کی طرح ہی مختصر افسانہ (Short_Story) کے فنی و تکنیکی پیمانوں پر سو فیصد پورے نہیں اترتے۔ راشد الخیری، سلطان حیدر جوشؔ اور پریم چند کے ابتدائی افسانوں کی طرح اسی عرصے (بیسویں صدی کے اوائل) میں لکھی گئی فوقؔ کی جن تحریروں کو مختصر افسانہ (منی افسانہ یا افسانچہ) کا نام دیا جاسکتا ہے وہ سب انگریزی Short.Story کی بجائے فارسی ’حکایت نگاری‘ کی روایت کے زیرِ اثر لکھی گئی مقصدی، (اخلاقی اور تربیتی) کہانیاں ہیں۔ (خود فوقؔ نے بھی اپنے شروعاتی مختصر افسانوں کو کہانی یا مختصر افسانہ کی بجائے حکایت کا نام دیا ہے۔) فوقؔ کے مختصر ترین افسانے بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں ہی مختلف اخبارات ورسائل میں شائع ہورہے تھے لیکن انھوں نے اپنے ان افسانوں کا پہلا مجموعہ ’’حکایاتِ کشمیر‘‘ کے نام سے ۱۹۲۸ء میں شائع کروایا۔ اس وقت تک، راشد الخیری، یلدرمؔ، سلطان حیدر جوشؔ اور پریم چند کے افسانوں کا ڈنکا تو بج ہی رہا تھا، ل۔ احمد اکبر آبادی اور پنڈت سدرشن سے لے کر نیازؔ فتح پوری، اور مجنوںؔ گورکھ پوری تک متعدد افسانہ نگار اردو مختصر افسانہ کی زمین کو آسمان کرنے میں مصروف تھے۔ لاہور، جو فوقؔ کا میدانِ عمل تھا، اُس زمانے میں اردو کا سب سے بڑا ادبی مرکز تھا۔ اردو کے سب سے زیادہ اخبارات ورسائل، مذہبی اور علمی کتب، ناول اور شعری وافسانوی مجموعے لاہور سے ہی شائع ہوتے تھے اور یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ فوقؔ جیسے سرگرم اور دیدہ ور ادیب، شاعر، مورخ اور صحافی کو اردو میں کہانی کی نئی صنف افسانہ کی پیش رفت کا علم نہ ہو؟ پھر بھی فوقؔ نے اپنے ’’کشمیر مرکز، تاریخی نوعیت کے افسانوں کو افسانے کی بجائے ’’حکایات‘‘ کا نام کیوں دیا؟ اس کی ایک وجہ تو یہ ہوسکتی ہے کہ فوقؔ ’’عاشق کشمیر‘‘ تھے۔ لاہور میں سکونت کے باوجود فوقؔ کی جملہ ادبی و علمی، تاریخی اور صحافتی حتیٰ کہ شعری سرگرمیوں کا مرکز ومحور کشمیر ہی ہوتا تھا۔ لاہور میں رہتے ضرور تھے لیکن جب موقع ملتا کشمیر وارد ہوجاتے۔ فوقؔ کا انتقال بھی سرینگر کشمیر سے لاہور واپسی پر ہوا۔ دوئم یہ کہ گرچہ مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے ۱۸۸۸ء میں اردو کو ڈوگرہ دربار کی سرکاری زبان بنانے کا حکم صادر کردیا لیکن کشمیر میں اس حکم کا اطلاق بیسویں صدی کی دوسری دہائی کے بعد ہی ہوسکا اردو سے پہلے فارسی ریاست کی سرکاری زبان تھی کشمیر میں اردو عوامی رابطے کی زبان کا درجہ حاصل کرنے لگی تھی لیکن علمی وادبی سرگرمیوں کے لئے فارسی اور کشمیری کے استعمال کا رواج عام تھا۔ حکایات سعدی اور مثنوی مولانا روم سے ہر کشمیری واقف تھا۔ لہٰذا عین ممکن ہے کہ اس صورت حال کے پیش نظر فوقؔ نے اپنے افسانوں کو ’’حکایات‘‘ کا نام دیا ہو۔ دوسری بات یہ کہ فوقؔ نے چونکہ کشمیر کے ماضی کی اہم شخصیات کی زندگی اور زمانہ کے روشن، تعمیری اور لائقِ تقلید واقعات پر اپنے افسانوں کی عمارتیں کھڑی کی ہیں جو ہئیتی اور موضوعاتی اعتبار سے ان کے معاصر افسانہ نگاروں کے افسانوں سے مختلف ہیں، لہٰذا ہوسکتا ہے کہ اس وجہ سے بھی فوقؔ نے اپنے افسانوں کو ’’حکایت‘‘ کا نام

دیا ہو۔ایک اور وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ کشمیری نژاد شاعرِ مشرق علامہ اقبال کے عزیز ترین معتقد اور دوست ،فوق انگریزی حکومت، تہذیب اور ادب آداب کے قائل نہ تھے اور انگریزوں سے اپنے وطن کی آزادی کے زبردست حامی بھی تھے۔اس لئے بھی ممکن ہے فوق نے انگریزی کی Short Story کی جگہ کہانی کی مشرقی صنف ''حکایت'' کی ہیت مین مقصدی اخلاقی اور تعمیری کہانیاں لکھنے کو ترجیح دی ہو۔دوسری جانب دیکھا جائے تو ،فوق کی طرح ،راشد الخیری ،جوش اور پریم چند کی ابتدائی کہانیاں بھی اسی نوعیت کی مقصدی ،اخلاقی اور اصلاحی کہانیاں ہی ہیں۔اس زاوئیے سے فوق کی حکایات کی اردو افسانہ سے مماثلت ثابت ہو جاتی ہے۔اب اگر فوق کی ''حکایات'' اور آج کے اردو ''افسانچہ'' یا ''منی افسانہ'' کے مابین فنی و تکنیکی مماثلتوں کا جائزہ لیا جائے تو حکایت اور مختصر افسانہ کی طرح ہی ،حکایت اور اردو افسانچہ یا منی افسانہ کے مشترکہ فنی وتکنیکی امتیازات کو ذہن میں رکھنا ہوگا۔لیکن یہ اصنافی تنقید Genre Criticism کے لئے ایک چیلنج سے کم نہیں۔حکایت کے بارے میں گیان چند جین نے اردو کی نثری داستانیں (صفحہ۔۵۰) میں لکھا ہے۔

''اردو میں مختصر اخلاقی کہانیوں کی تمام اقسام کو حکایات کہتے ہیں''

اور اتنی بات تو سبھی جانتے ہیں کہ اردو میں ،فارسی (عربی) سے صرف شعری اصناف ہی نہیں لئے گئے۔کئی نثری اصناف، مثلاً، داستان، تذکرہ، تحقیق، تنقید، تاریخ نگاری ،سیرت نگاری ۔۔۔۔۔۔وغیرہ بھی فارسی سے ہی اردو تک پہنچیں۔عربی فارسی اور اردو میں لفظ ''حکایت'' قصہ کہانی ،واقعہ کے معنی میں ہی استعمال کیا جاتا رہا ہے۔مشہور شعر ہے :

سنی حکایت ہستی تو درمیاں سے سنی نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

مختصر افسانہ کیا ہے اور کیا نہیں؟ آج بھی یہ ایک ٹیڑھا سوال ہے۔حسن عسکری کے بقول:

''افسانے پر ہیت کے اعتبار سے پوری سنجیدگی کے ابھی تک غور ہی نہیں ہوا ہے، افسانے کی تسلی بخش تعریف بھی ابھی تک نہیں ہو سکی ہے۔۔۔۔۔بعض نقادوں کی رائے ہے کہ افسانہ کے اصول مرتب ہو ہی نہیں سکتے اور نہ ہونے چاہئیں۔یہ ادب کی آزاد صنف ہے اور اس کے حق میں یہی بہتر ہے کہ ہر افسانہ نگار اپنے اصول خود بنائے ،کسی روایت یا اصول کی پابندی نہ کرے اور درحقیقت ہوتا بھی یہی رہا ہے۔مثلاً یہی دیکھئے کہ بعض افسانے بس صفحے بھر کے ہوتے ہیں ،بعض پچاس ساٹھ صفحوں کے افسانے کو مختصر افسانہ کہا جائے یا طویل مختصر افسانہ؟ دیکھنے میں یہی آیا ہے کہ لکھنے والے کا جی چاہا تو اپنے افسانے کو مختصر کہہ دیا، جی چاہا طویل مختصر افسانہ کہہ دیا، بلکہ مختصر ناول۔'' (مقالات محمد حسن عسکری۔ص۔۳۹۲)

اردو افسانہ کے معتبر محقق مرزا حامد بیگ نے بھی لکھا ہے،

افسانہ کو ''مخزن'' جیسے اہم جریدے میں تادیر ''مضمون'' یا قصہ'' کہا جاتا رہا'' اردو افسانے کی روایت ۔صفحہ۔۴۵

ویسے یہ بات صحیح ہے کہ مختصر افسانہ Short Story بالغ قارئین کے لئے لکھا جاتا ہے جب کہ حکایت بچوں، نوجوانوں اور عام لوگوں کی کردار سازی اور ذہنی تربیت کے لئے لکھی جاتی ہے۔ دوئم یہ کہ مختصر افسانہ، سماجی، سیاسی، نفسیاتی یا جنسی کسی بھی موضوع پر لکھا جاسکتا ہے لیکن حکائت میں اتنی آزادی نہیں۔ حکایت میں حکمت و ہدائت، پند و نصیحت اور اخلاقی اور اصلاحی موضوعات پر کہانی کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ تا کہ عام لوگوں میں اعلیٰ صفات اور ایک اچھی زندگی کا ذوق اور شعور پیدا ہوسکے۔ حکایت نگاری کا مقصد بھی یہی ہے۔ دوسرے لفظوں میں افسانے کا مقصدی ہونا ضروری نہیں (کلاسیکی اور ترقی پسند افسانہ نگار مقصدیت کے حامی تھے اور جدیدیت پسند مخالف) لیکن حکایت کے لئے مقصدیت شرط ہے۔ دراصل انسان کو اپنی فطرت کے فاصد عناصر کو قابو میں رکھنے کے لئے کسی اخلاقی نظام میں پناہ لینا بھی ضروری ہے۔ لہٰذا کسی افسانہ میں اصلاحی مقصد کی موجودگی کو اس افسانے کا عیب نہیں ہنر ہی قرار دینا مناسب ہوگا۔ افسانہ کے سابقہ مغربی ناقدین نے بھی افسانہ کے موضوع یا مقصد کی حد بندی نہیں کی ہے۔ اردو میں فکشن کے معتبر ناقد اور محقق محترم وقار عظیم نے بھی اردو افسانہ کے منفرد صنفی امتیازات کی نشاندہی کرتے ہوئے افسانہ کے اصلاحی اور مقصدی کردار کی حمایت ہی کی ہے۔ لکھتے ہیں،

> ''افسانہ، کہانی میں پہلی مرتبہ وحدت کی اہمیت کی مظہر ہے۔ کسی ایک احساس، ایک تاثر، ایک اصلاحی مقصد، ایک رومانی کیفیت کو اس طرح کہانی میں بیان کرنا کہ وہ دوسری چیزوں سے الگ اور نمایاں ہو کر پڑھنے والے کے جذبات واحساسات پر اثر انداز ہو، افسانہ کی وہ امتیازی خصوصیت ہے جس نے اسے 'داستان اور ناول سے الگ کیا ہے''۔

بحوالہ: ''اردو میں فکشن کی تنقید؛ از۔ ڈاکٹر ارتضیٰ کریم۔ صفحہ۔ ۴۰۶

ڈاکٹر ارتضیٰ کریم نے بھی 'اردو فکشن کی تنقید' میں مختلف مغربی اور اردو ناقدین کے حوالے سے ''افسانہ'' کے صنفی، فنی و تکنیکی شرائط و امتیازات پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ اور ان کی باتوں سے نتیجہ یہ سامنے آتا ہے کہ

> ''ہر وہ کہانی جس میں کسی ایک جذبہ، تاثر، کیفیت یا اصلاحی مقصد کو پُر تاثیر انداز میں بیان کیا گیا ہو ''افسانہ'' ہے۔''

اب، افسانہ کتنا مختصر یا طویل ہو اس مسئلے کو وقار عظیم یا ارتضیٰ کریم نے نہیں چھیڑا ہے۔ البتہ بعض مغربی دانشوروں نے افسانہ کو ناول سے الگ صنف قرار دینے کے لئے قرات میں وقت کے اصراف (آدھے گھنٹے سے دو گھنٹے تک) کو بنیاد بنایا ہے جو بڑی مضحکہ خیز سی بات لگتی ہے۔

ایک اور بات یہ بھی ہے کہ اختصار، حکایت، افسانچہ یا منی افسانہ کا فنی و تکنیکی لازمہ ہے جب کہ مختصر افسانہ Short Story میں ناول کی طوالت کے حوالے سے اختصار کی بات کی جاتی ہے۔ لیکن معاملہ یہ ہے کہ مختصر افسانہ کیا، افسانوی ادب کی کسی بھی صنف کے لئے طوالت یا اختصار کی کوئی حد مقرر نہیں ہے، ہو بھی نہیں سکتی۔ داستان کا قصہ تو یہ ہے کہ ''نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم''، اسی طرح ہزار پانچ سو صفحات پر مشتمل ''آگ کا دریا''، ''اداس نسلیں'' اور ''لہو کے پھول'' بھی ناول ہیں اور سو، سوا سو، ڈیڑھ سو

صفحات پر مشتمل ''ایک چادر میلی سی'' (بیدی)، ''باز دید'' (جوگندر پال)، ''لل دید'' (ویدراہی) اور ''نیلما'' (شفق سوپوری) بھی بلا شبہ ناول ہی ہیں۔ (کیوں ہیں یہ الگ بحث ہے)۔ اسی طرح اردو مختصر افسانہ کتنا مختصر ہو یہ بھی طے نہیں ہے۔ اردو میں قرۃالعین حیدر کے ''ڈالن والا''، اور ''ہاوسنگ سوسائٹی'' اور قدرت اللہ شہاب کے ''یا خدا' بھی افسانے ہی ہیں۔ البتہ ان کے ساتھ 'طویل' کا لاحقہ بھی لگا دیا جاتا ہے۔ کچھ لوگ ناولٹ کہہ کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ اب عبداللہ حسین نے ناول اور افسانہ کے درمیان سے کہانی کی ایک نئی شکل پیدا کرلی ہے جسے وہ ''ناولا'' کہتے ہیں، جو نہ تو ناول کی طرح ضخیم ہوتا ہے نہ افسانے کی طرح مختصر۔ لیکن اردو میں مختصر افسانہ کے بعد کی افسانوی صنف افسانچہ یا منی افسانہ، کی طرح حکایت بھی چند سطروں یا ایک آدھ صفحہ پر ہی مشتمل ہوتی ہے۔ آج کے محاورے میں اتنی مختصر کہانی کو ہی ''منی افسانہ'' یا ''افسانچہ'' کہتے ہیں۔ دوئم یہ کہ کسی بھی تحریر کو داستان، ناول، افسانہ، حکایت، افسانچہ یا منی افسانہ قرار دینے کے لئے سطریں یا صفحات نہیں، ''کہانی پن'' کو بنیادی شرط مانا گیا ہے۔ لہٰذا فوق کی حکایتوں میں کہانی پن ہے یا نہیں اس کا جائزہ لینے سے پہلے افسانچہ نگار ڈاکٹر محبوب راہی کا یہ اقتباس دیکھ لیں:

> ''وہ عنصر جو کہانی کی جان ہوتا ہے۔۔۔۔۔ وہ ہے کہانی پن اور یہ کہانی پن چاہے داستان میں ہو، ناول میں ہو، افسانے میں یا افسانچہ میں۔ یہ ''کہانی پن''، کہانی کے ایک باب، ایک صفحہ ایک پیراگراف یا ایک جملے میں بھی سمویا جا سکتا ہے۔ اس کے آس پاس واقعاتی تسلسل کے ساتھ، چند حقائق، کچھ زیب داستاں کے لئے، ان تمام کے متناسب اور متوازن اشتراک باہم سے۔''

لیکن اس ضمن میں بھی دو باتیں اہم ہیں۔ اول یہ کہ، افسانہ کے لئے کہانی پن ہی کافی نہیں، کہانی بیان کرنے کا سلیقہ بھی ضروری ہے یعنی افسانہ نگار کو بیانیہ پر اتنی قدرت حاصل ہو کہ قاری افسانہ پڑھتے ہوئے شروع سے آخر تک اس بیان میں کھو جائے۔ چیخوف کی مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ کہانی کے بیان یا قصہ گوئی کا بادشاہ تھا۔ ناخواندہ لوگ بھی چیخوف کے افسانے سن کر ان سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ اردو میں راشد الخیری، سلطان حیدر جوش، پریم چند اور علی عباس حسینی وغیرہ کے افسانوں میں کہانی پن بھی ہے اور کہانی بیان کرنے کا منجھا ہوا انداز بھی کہ ان پڑھ لوگ بھی ان کی کہانیاں سن کر نہال ہو جاتے تھے۔ لیکن انگریزی میں ایچ۔ ای۔ بیٹس اور الزبتھ بوون کے یہاں اور اردو میں سجاد حیدر یلدرم اور جدید افسانہ نگاروں میں بلراج مینرا، کمار پاشی، احمد ہمیش، انور سجاد اور رشید امجد وغیرہ نے شروع میں چند ایک ایسے افسانے بھی لکھے، جن میں کہانی مفقود ہے۔ رشید امجد نے تو جدیدیت پسندی کے جوش جنوں میں بہت آگے نکل کر یہاں تک کہہ ڈالا تھا کہ:

> ''لفظ افسانویت (کہانی پن) بوڑھے نقادوں کا جمایا ہوا لفظ معلوم ہوتا ہے جس کے میرے نزدیک کوئی معنی نہیں''

کمار پاشی نے بھی افسانویت کی اصطلاح کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا تھا:

''جدید افسانہ نے افسانے کو افسانہ پن سے نجات دلا کر اسے تخلیقی ذائقہ سے روشناس کرایا ہے۔''

گرچہ جدیدیت کا زور ٹوٹتے ہی یہ دونوں حضرات اپنے ان بیانات پر پچھتائے اور ایسے عمدہ افسانے لکھے جن میں کہانی پن اور بیانیہ کو بڑی مہارت کے ساتھ برتا گیا ہے۔ بہر حال گفتگو فوقؔ کی حکایات اور افسانچہ کے حوالے سے افسانہ مسیں کہانی پن اور اختصار کی ہو رہی تھی۔ مشہور افسانچہ نگار اور نقاد ڈاکٹر عظیم راہی نے اپنی تحقیقی و تنقیدی تصنیف ''اردو میں افسانچہ کی روایت'' میں عالمی سطح پر افسانچہ کی صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے اختصار کے حوالے سے افسانچہ کو Define کرنے کی جو کوشش کی ہے اس سے افسانہ کی مختصر ترین صورتوں حکائت، افسانچہ یا منی افسانہ کے اختصار اور کہانی پن کی بات کچھ اور واضح ہو جائے گی۔

''افسانچہ دراصل اس قدر Compact (مختصر) جامع ہونا چاہئے کہ اس کا تاثر (impact) پوری شدت سے قاری کے ذہن پر اثر انداز ہو کر، تا دیر قائم رہ سکے۔ بنیادی طور پر یہ فن پارے کی اولین شرط ہے لیکن جب بات بہت مختصر لفظوں میں مکمل طور پر کہنی ہو تب یہ شرط اور بھی کڑی ہو جاتی ہے۔''

عظیم راہی؛ اردو میں افسانچہ کی روائت؛ تنقیدی مطالعہ۔ص ۲۴

اس ساری بحث سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ حکایت، منی افسانہ یا افسانچہ بھی ''افسانہ'' ہے خواہ اس میں چند سطروں میں ہی کسی کہانی کو کیوں نہ بیان کیا گیا ہو، بالکل اسی طرح جس طرح غزل کا ایک مکمل شعر بھی ''شاعری'' ہے اور ہزار اشعار پر مشتمل نظم (مثنوی) بھی شاعری ہے۔ سعادت حسن منٹو کے ''سیاہ حاشئے'' کی منی کہانیوں یا افسانچوں کو افسانہ یا Story ماننے سے کوئی انکار نہیں کرتا۔ حسن عسکری نے بھی انھیں ''چھوٹے چھوٹے افسانے'' ہی کہا ہے۔ اب اگر ''فارسی کے حکایات سعدیؔ'' کو ذہن مسیں رکھتے ہوئے محمد الدین فوقؔ نے بھی اپنے چھوٹے چھوٹے افسانے ''حکایت'' کے نام سے پیش کئے ہیں تو آج کی تاریخ میں اسے 'منی افسانہ یا افسانچہ کی طرح، افسانہ ماننے سے انکار کرنا محال ہے۔ اس زاوئیے سے اگر دیکھیں تو محمد الدین فوقؔ ریاست جموں و کشمیر کے پہلے افسانہ نگار قرار دئیے جانے کا پورا حق رکھتے ہیں۔ ویسے یہاں جملہ معترضہ کے طور پر اگر یہ بھی کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ افسانہ کے جس مختصر ترین روپ کو افسانچہ یا منی افسانہ کہا جاتا ہے۔ اس کے لئے ''حکایت'' کا لفظ استعمال کرنے میں کیا مضائقہ ہے؟ آخر ہم نے غزل، مثنوی، قصیدہ وغیرہ اصناف کو ان کے اصطلاحی معنی ہی نہیں روایات اور رسومیات، قواعد اور رجحانات کے ساتھ اپنا یا ہی ہے تو پھر مسائل زدہ، اور اقداری نظام سے محروم برصغیر میں اگر مروجہ صنف ''افسانہ'' سے الگ اصلاحی اور تعمیری مقاصد کے لئے افسانچہ (یا منی افسانہ) کو حکایت کے نام سے ہی فروغ دیا جائے تو اردو ادب کا بھلا ہی ہوگا۔ ایسا لگتا ہے کہ شعوری یا لاشعوری طور پر اس کی شروعات محمد الدین فوقؔ نے اپنی حکایات سے کر دی تھی۔ محمد حسن عسکری تو فرما ہی گئے ہیں کہ ''افسانہ آزاد صنف ہے اور اس کے حق میں یہی بہتر ہے کہ ہر افسانہ نگار اپنے اصول خود بنائے کسی روایت اصول کی پابندی نہ کرے''۔ اب اگر فوقؔ نے اپنے افسانوں کو، مضمون یا قصہ یا افسانہ کے بجائے ''حکایت'' کا نام دیا ہے تو واضح ہے کہ انہوں نے دانستہ طور پر ایسا کیا ہے اور اسے غلط نہیں کہا جا سکتا ہے۔ محمد دین فوقؔ نے انیسویں صدی کے اخیر اور بیسویں صدی کے اوائل سے ہی شعر و شاعری، تحقیق و تنقید نگاری،

ناول نگاری اور صحافت کے ساتھ ساتھ مختصر افسانہ نگاری شروع کر دی تھی۔لیکن فوقؔ نے اپنے مختصر ترین افسانوں کو شعوری طور پر ''حکایات'' کا نام دیا، اور اس کے اسباب کی وضاحت کی جا چکی ہے ۔فوق کی مختصر ترین افسانوں کے تین مجموعے شائع ہوئے ہیں ۔۱۔''حکایات کشمیر۔ ۲۔سبق آموز کہانیاں ، اور ۳۔د بستان اخلاق''۔تقسیم ملک کے بعد تک ان مجموعوں کے کئی کئی اڈیشن شائع ہوئے لیکن اب یہ کتابیں نایاب ہیں۔فوقؔ کے اِن افسانوی مجموعوں میں ''حکایات کشمیر'' اہم ہے۔ ۱۲۸ پر مشتمل ''حکایات کشمیر'' پہلی بار ۱۹۲۸ء میں ''ظفر برادرس لاہور'' کے زیر اہتمام شائع ہوئی۔اس کے بعد اس کتاب کے کئی اڈیشن شائع ہوئے تقسیم ملک کے بعد پاکستان اور جموں کشمیر میں بھی یہ کتاب شائع کی جاتی رہی۔ ۱۹۸۳ء میں حکایات کشمیر کا ایک اڈیشن ''شاہین بک اسٹال اینڈ پبلشرز سرینگر کشمیر نے شائع کیا تھا لیکن اب یہ کتاب نایاب ہے۔محمد دین فوقؔ کی ''حکایات کشمیر'' میں ۲۳۔ کہانیاں شامل ہیں جو کشمیر کے راجوں مہاراجوں اور مسلمان بادشاہوں کی زندگی اور زمانہ کے دلچسپ اور اہم واقعات پر مبنی ہیں۔گورنمنٹ کالج لاہور کے ڈاکٹر محمد منیر اجمل خان نیازی نے اپنے مقالے ''محمد الدین فوقؔ۔اور اُن کی علمی و ادبی خدمات میں لکھا ہے کہ

> ''فوقؔ نے اس کتاب کے آغاز میں ''کشمیر جنت نظیر'' کے نام سے ایک مختصر دیباچہ لکھا ہے، جس میں کشمیر کا حسن، اس کا حدود اربعہ اور مختصر تاریخ بیان کی گئی ہے۔ان حکایات کے ذریعے انھوں نے کشمیر کے ساتھ اپنی وابستگیوں کو (لوگوں) کے دلوں میں جاگزیں کرنے کی کوشش کی ہے'' صفحہ۔۶۲۱

فوقؔ نے اس کتاب میں جموں و کشمیر کے جن حکمرانوں کے حوالے سے کہانیاں پیش کی ہیں ان کے اسمائے گرامی اس طرح ہیں۔

۱۔راجہ ہرن دیو ۔ ۲۔راجہ سندر سین ۔ ۳۔راجہ جلوک ۔ ۴۔راجہ توتا سین ۔ ۵ راجہ سندھی متی ۔ ۶۔راجہ میگھ واہن ۷۔راجہ ماتر گپت ۔ ۸۔راجہ پردر سین ۔ ۹۔راجہ چندرا بھان ۔ ۱۰۔ذاہدہ للتادتیہ ۔ ۱۱۔راہبہ جیا پیڈ اور اس کا جاں نثار وزیر۔۔۔۔شرما۔ ۱۲۔راجہ اونتی ورمن اور وفادار وزیر شکھر ورمن ۔ ۱۳۔راجہ اونتی ورمن اور ایک کمہار کا عقل مند بیٹا ۔ ۱۴۔رانی سوگندھا ۔ ۱۵۔راجہ پشکر ۔ ۱۶۔راجہا وپل ۔ ۱۷۔راجہ عجب دیو ۔ ۱۸۔راجہ رنجیت دیو ۔ ۱۹۔کرنل میاں سنگھ کمیدان ۔ ۲۰۔مہاراجہ رنبیر سنگھ ۔ ۲۱۔راجہ دھیان سنگھ ۔ ۲۲۔ہر دلعزیز سلطان زین العابدین ۔ ۲۳۔عیاش بادشاہ یوسف چک۔''

مذکورہ بالاحکمرانوں کی کہانیوں میں فوق نے اعلی اخلاق، بہادری، جاں نثاری، وفاداری، علم دوستی اور غریب پروری جیسے موضوعات پر مبنی واقعات اس طرح پیش کئے ہیں کہ قاری کے اندر مثبت کردار و سیرت کی تعمیر کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔فوقؔ کشمیری تھے، کشمیر سے انھیں عشق تھا اور وہ اہل کشمیر کے دلوں میں قومی تشخص اور حب الوطنی کے اوصاف کو مزید بیدار اور مستحکم کرنا چاہتے تھے چنانچہ، شاعری، صحافت اور تحقیق و تنقید کی طرح فوق کے افسانوں کے مرکز میں بھی حب الوطنی کا جذبہ کار فرما ہے اپنے ایک افسانہ ''راجہ ماتر گپت اور ایک فوجی سالار پرورسین'' کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''پرورسین نے پنجاب کا بہت سا علاقہ فتح کر لیا، اس کے بعد اس کے صلاح کاروں نے اس کو مشورہ دیا کہ اپنے آبائی ملک کشمیر پر حملہ کیا جائے۔اس نے جواب دیا کہ ''دو باتیں ہیں جو مجھے اپنے آبائی ملک پر حملہ کرنے سے روک رہی ہیں۔ایک تو یہ کہ ماتر گپت ایک شاعر۔اس پر حملہ کرنا ایک ایسے

شخص کی شان سے بعید ہے، جس کی رگوں میں نسلاً بعد نسلاً بادشاہی خون حرکت کر رہا ہو۔ دوسرا یہ کہ کشمیر میرا وطن ہے، میرا ملک ہے، اگر میں نے وہاں حملہ کیا، تو میرے اہل وطن ہلاک ہوں گے، اُن کی فصلیں تباہ ہوں گی، وہ فاقہ کشی کے شکار ہوں گے اور کئی لوگ بے موت مر جائیں گے (صفحہ۔ ۳۰)

اسی طرح کشمیر کے مسلمان بادشاہوں کی انسان دوستی اور وسیع المشربی کو فوق نے اپنی کہانی "ہر دلعزیز سلطان، زین العابدین" میں بیان کیا ہے۔ کشمیر کے حکمرانوں میں سلطان زین العابدین کے جیسا انسان دوست اور انصاف پسند بادشاہ کوئی دوسرا نہیں ہوا ہے۔ اسی لئے کشمیر کی تاریخ میں سلطان زین العابدین کو "بڈشاہ" (عظیم بادشاہ) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ آج بھی کشمیر میں "بڈشاہ" کے نام پر کئی پُلوں، چوراہوں اور تعلیمی وطبی اداروں کے نام سے موجود ہیں۔ فوقؔ نے "حکایات کشمیر" میں شامل ایک کہانی "ہر دل عزیز سلطان زین العابدین" میں لکھا ہے،

"اس سلطان نے ہندوؤں کے واسطے جو کچھ کیا، وہ، ہندوؤں کے لئے کسی ہندو راجہ سے بھی نہ ہو سکا۔ اس نے جلاوطن ہندوؤں کو واپس بلایا، اور انہیں جائدادیں دیں، عہدے دئے، اور جزیہ معاف کر دیا۔ صفحہ۔ ۸۳

فوق کے مذکورہ بالا افسانے ویسے ہی ہیں جیسے کہ پریم چند کے اسی دور کے افسانوں "رنجیت سنگھ، رانی سارندھا، وکرمادتیہ کا تیغہ، راجہ ہردول، اور آلھا" وغیرہ ہیں۔ پریم چند کے کے ایسے افسانوں سے دو مختصر اقتباسات دیکھتے چلیں:

۱۔ "چوہان راجہ، آداب جنگ کو کبھی ہاتھ سے جانے نہ دیتا تھا۔ اس کی ہمت عالی، اسے کمزور، بے خبر اور نا مستعد دشمن پر وار کرنے کی اجازت نہ دیتی تھی۔"

۲۔ "رنجیت سنگھ، سخاوت وشجاعت اور رحم وانصاف میں اپنے وقت کے وکرمادتیہ تھے۔ اس مغرورِ کابل کا غرور، جس نے صدیوں تک ہندوستان کو سر نہیں اٹھانے دیا تھا، خاک میں ملا کر لاہور جاتے تھے۔"

اگر پریم چند کے مذکورہ بالا افسانوں کو "افسانہ مانا جاتا ہے تو پھر اسی نوعیت کے فوقؔ کے افسانوں کو افسانہ کیوں نہیں تسلیم کیا جا سکتا۔

اردو کے ابتدائی افسانوں، نصیر اور خدیجہ (راشد الخیری) نابینا بیوی (سلطان حیدر جوش) اور دنیا کا انمول رتن (پریم چند) وغیرہ کی طرح فوق کے "حکایاتِ کشمیر" کے افسانوں (حکایتوں) کے عنوانات بھی افسانہ کے نفس مضمون کو واضح کرنے والے ہوتے ہیں، مثلاً، ۱۔ راجہ عجب دیو کا انصاف۔ ۲۔ عیش پرست بادشاہ کا انجام۔ ۳۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ کی علم نوازیاں۔ ۴۔ جاں نثار وزیر۔ وغیرہ۔

محمد دین فوقؔ کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ "سبق آموز کہانیاں" ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں ۳۶ مختصر افسانے شامل ہیں۔ ان میں دنیا بھر کی تاریخ سے لئے گئے مختلف قوموں کے لوگوں کی کہانیاں بیان کی گئی ہیں۔ یہ کہانیاں بھی فوقؔ نے بچوں اور بڑوں میں اعلیٰ اخلاقی صفات پیدا کرنے کی غرض سے لکھی ہیں۔ سرسید کے "گزرا ہوا زمانہ" کی طرح فوق نے بھی "سبق آموز کہانیاں" کی ہر کہانی کے اختتام پر کہانی سے حاصل ہونے والا سبق یا نتیجہ بھی درج کیا ہے جس سے کہانی بیان کرنے کا مقصد قاری

کے ذہن نشیں ہوجاتا ہے۔ ’’حکایاتِ کشمیر‘‘ کی طرح ’’سبق آموز کہانیاں‘‘ میں شامل افسانوں (کہانیوں) کے عنوانات بھی نفس مضمون کو واضح کر دینے والے ہیں مثلاً چند کہانیوں کے عنوانات ملاحظہ ہوں۔

۱۔مہمان نواز کی شرافت۔ ۲۔بخل کا انجام۔ ۳۔ملاح کی دانشمندی۔ ۴۔ایک غریب کی نورانی ایجاد۔ ۵۔وطن کی محبت۔ اور ۶۔مردانہ استقلال، وغیرہ۔فوق کا ایک مختصر ترین افسانہ (افسانچہ یا منی افسانہ) جس کا عنوان ’’مردانہ استقلال‘ ہے فرض شناسی اور جرات مندی پر مبنی یہ افسانہ اس طرح ہے،

’’اپسیا ریلوے لائن سے ایک اسپیشل ٹرین گذرنے والی تھی۔کانٹے والے کا نام، یوئینگ تھا۔جب ٹرین کا انجن کانٹے سے گزرنے لگا تو کانٹے کے سوراخ سے ایک بڑا بھاری بھورا سانپ نکل کر کانٹے پر چڑھ گیا۔اور کانٹے والے کے ہاتھ سے ہوتا ہوا اس کے سر اور پشت سے گزر کر زمین پر اتر گیا۔اگر یوئینگ کانٹا چھوڑ دیتا تو گاڑی کے ٹکڑے ہوجاتے۔مگر شیر دل یوئینگ کانٹے کے ڈنڈے کو پکڑے ہی رہا اور ٹرین گزر گئی۔جب اس نے کانٹا چھوڑ کر دیکھا تو سانپ کا کہیں پتہ نہ تھا۔لوگوں نے پوچھا کہ’’سانپ نے کاٹا تو نہیں؟ تو یوئینگ مسکرایا، مجمع سے ایک آدمی نے کہا،’’اور وہ جو کاٹ لیتا تو بچہ سیدھا ہی سدھار جاتے۔

یوئنگ نے جواب دیا،

’’اگر میں ذرا بھی ہلتا تو وہ مجھے کاٹ لیتا اور اگر میں کانٹا چھوڑ دیتا تو اسپیشل ٹرین تباہ ہوجاتی اور تمام مسافر ہلاک ہوجاتے۔

’’جب لوگوں نے اس کی زبان سے یہ الفاظ سنے تو اس کی بہادری کی تعریف کی۔اور اس کی ترقی بھی ہوگئی۔

نتیجہ۔کسی سے لڑائی لڑ کر اسے پچھاڑ دینا مردانگی اور بہادری نہیں۔ بلکہ بہادری ’’مردانہ استقلال‘‘ کو کہتے ہیں اور مردانہ استقلال کی مثال کانٹے والے کی سچی کہانی ہے۔مصیبت کے وقت ہمیشہ مستقل مزاج رہو، مصیبت کبھی اثر نہ کرے گی۔

افسانہ؛ مردانہ استقلال

مشمولہ؛ سبق آموز کہانیاں؛ از محمد الدین فوق۔ص۔ ۶۲

مذکورہ بالا افسانہ اور اس نوعیت کے دوسرے افسانے یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ فوقؔ کے افسانے کامیاب افسانے ہیں، کیونکہ فوقؔ کے افسانے قاری کو غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں اس نکتے کو شمس الرحمن فاروقی کے اس اقتباس کے حوالے سے بھی سمجھا جا سکتا ہے، فاروقی کے مطابق:

اگر افسانہ پڑھ کر محسوس ہو کہ اس میں کوئی غور طلب بات ہے، اور جس نثر میں وہ لکھا گیا ہے وہ افسانوی ہو، شاعرانہ نہ ہو تو افسانہ اپنی پہلی منزل میں کامیاب ہے‘‘۔

شمس الرحمن فاروقی؛ شعر غیر شعر نثر۔صفحہ۔ ۱۹۳

اور فوقؔ کے افسانوں میں یہ باتی موجود ہیں۔ غرض یہ کہ افسانہ کے جن فنی تقاضوں کا ذکر پریم چند نے ''سوزِ وطن'' کے دیباچہ اور اپنے مضامین ''مختصر افسانہ''، مختصر افسانے کا فن''، ''میرے بہترین افسانے''، ''راشد الخیری کے افسانے''، ''ہماری قوت بیانیہ کا زوال''، وغیرہ میں کیا ہے۔ (پریم چند کے یہ مضامین ۱۹۰۸ء اور ۱۹۳۳ء کے دوران شائع ہوئے) یا پھر عبد القادر سروری کی تصنیف ''دنیائے افسانہ'' (۱۹۲۷ء) اور مجنوں گورکھ پوری کے ''افسانہ اور اس کی غایت'' ۱۹۳۵ (ء) سے لے کر وقار عظیم (''فن افسانہ نگاری، داستان سے افسانے تک، اور نیا افسانہ) شمس الرحمن فاروقی (شعر غیر شعر نثر) ڈاکٹر ارتضیٰ کریم (اردو فکشن کی تنقید) اور کئی دوسرے ناقدین نے افسانہ کے جن بنیادی امتیازات کی نشاندہی کی ہے ان میں سے بیشتر محمد الدین فوق کے افسانوی مجموعوں ''حکایات کشمیر'' اور ''سبق آموز کہانیاں'' میں شامل مختصر افسانوں میں موجود ہیں۔

فوق کے افسانوں کی زبان سادہ اور عام فہم ہے۔ ہیئت (Form) فارسی اردو حکائت اور جدید دور کے افسانچوں/منی افسانوں کی ہے موضوعی نوعیت اصلاحی اور تعمیری ہے۔ بیانیہ میں تاریخی، اخلاقی اور انسانی اقدار، کے علاوہ فرقہ وارانہ اتحاد اور کشمیری قوم کی اصلاح اور بیداری کے حوالے سے، فوق کے افسانوں میں Discourse Narratology کے علاوہ Story Narratology کو بھی عمدگی کے ساتھ برتا گیا ہے جو ان کے افسانوں کو نئے جہات سے روشناس کرواتے ہیں۔ فکشن کے مشہور ناقد پروفیسر شافع قدوائی نیا پنے مضامین میں Narratology کے حوالے سے جو وضاحتیں کی ہیں ان کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ فوق کے افسانوں کے متون تاریخی لازمیت کی Teleology سے جڑے ہوئے ہیں اور اس امتیاز کی بنا پر فوقؔ کے افسانے، انتظار حسین اور اردو کے کئی دیگر ابتدائی افسانہ نگاروں کے افسانوں کی طرح مشرق کی مختلف النوع افسانوی ہئیتوں، داستان، لوک کتھا، قصہ اور حکایت وغیرہ کی روایات اور رسومیات سے مضبوط جدلیاتی رشتہ رکھتے ہیں۔ ان امتیازات کی بنیاد پر فوقؔ کو ریاست جموں وکشمیر کا پہلا افسانہ نگا تسلیم کرنے سے کسی کو انکار نہیں ہونا چاہے۔ ایک اور اہم بات بھی قابل غور ہے کہ ، عظیم راہی کے مطابق اردو میں ''افسانچہ نگاری کی ابتدا سعادت حسن منٹو کے ''سیاہ حاشئے'' سے ہوتی ہے، ان کی اس تحقیق کی قدر و قیمت اپنی جگہ لیکن اگر یہ دیکھیں کہ ''سیاہ حاشئے'' کی اشاعت ۱۹۴۷ء۔ کے بعد عمل میں آئی جب کہ محمد الدین فوقؔ کے ''چھوٹے چھوٹے افسانوں'' کا پہلا مجموعہ ''حکایات کشمیر'' ۱۹۲۸ء میں اور دوسرا مجموعہ ''سبق آموز کہانیاں'' ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا تھا لہذا اس بنیاد پر ''افسانچہ یا منی افسانہ'' کا بنیاد گذار منٹوؔ کے بجائے محمد الدین فوق کو قرار دینے پر بھی غور کیا جا سکتا ہے۔